Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.77, 2009, pp 05 - 30

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، شمارہ ۷۷، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۹ء

مولانا محمد علی جوہرؔ کی ملّی خدمات

مسز زریں۔ ایس ریاض ☆

Abstract:

It is difficult to enumerate the innumerable service rendered by Maulana Muhammad Ali Jouhar in religious, national, political and legal spheres. His dedication and sincerity to his goals in every sphere made him a beacon. His commitment was always above board As a journalist, he preferred the editorship of 'Comrade' over the offer of the post of Chief Minister. The Might of the British rule could not deter him from publishing the famous article, 'The Choice of the Turks' in the 'Comrade' in 1914 and confinement could not drift him. As a politician he ruled the hearts of the masses. His achievements were mainly because of his sincerity, determination and honesty. His deeds will always be written in golden words and remembered with pride.

Key words: Maulana Jauhar, Muslim leader, Subcontinet, National services'

محمد علی جوہرؔ کی دلچسپ اور پر وقار شخصیت ایک ایسی با کمال شخصیت ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے یہ وہی شخصیت ہے جس نے قوم اور ملک کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی۔ ہر لیڈر کی خدمات اگرچہ گراں قدر ہوتی ہیں مگر ان کی نوعیت سب سے الگ تھی۔ ان کی سرگرم عمل شخصیت کا تجزیہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

☆ شعبہ علوم اسلامیہ، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

مولانا محمد علی جوہرؔ کا نام لیتے ہوئے ہمارے ذہن میں ایک تو ان کی ظاہری تصویر ابھرتی ہے۔ سیاہ داڑھی، رومی ٹوپی اور رومی ٹوپی پر چمکتا ہوا چاند ستارا، جو ایک نمایاں تحریک کی نشاندہی کرتا تھا تحریک دم توڑ گئی مگر یہ چاند ستارا محمد علی جوہرؔ کی مستقل مزاجی اور وضع داری کا نشان بن کر ہمیشہ چمکتا رہا۔ اس چاند ستارے سے بھی زیادہ روشن اور کشادہ پیشانی ان کی ذہانت کی گواہ تھی۔ اور ایک ان کی معنوی تصویر ہے جس میں وہ کبھی کھدر میں ملبوس نظر آتے ہیں اور کبھی بھرے جلسہ کو رلاتے رلاتے ہنسا دیتے ہیں اور کبھی جیل کی چاردیواری کے پیچھے حمد وثنا میں مصروف نظر آتے ہیں ان کی شان نرالی اور کام انوکھے تھے۔ ان کے عمل کی شدت اور تیزی کو کوئی طوفان متزلزل نہ کر سکا۔ جیل کی سلاخیں سدّ راہ نہ ہوسکیں اور دشمنوں کی تنقید ان کے بڑھتے ہوئے پاؤں نہ روک سکی۔

بلا شبہ ان کی زندگی ایک مومن اور مجاہد کی زندگی تھی کہیں وہ ملک کے نام پر دشمنوں سے الجھتے نظر آئے۔ کہیں قوم کے حق میں دیگر افراد سے برسرِ پیکار رہے۔ اور کہیں اسلام کے نام پر جان کی قربانی دینے کے جذبے سے سرشار نظر آئے۔ ان کی پوری زندگی مردِ مومن کی زندگی تھی جس کے متعلق اقبال نے فرمایا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
بزم ہو، رزم ہو پاک دل و پاک باز [۱]

ملّی خدمات

محمد علی جوہر اور ان کی سیاست قوم و ملک کی خدمت سے الگ حصہ یا الگ پہلو نہیں

وہ قوم و ملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے وہ خدمت تلوار سے ہو یا قلم سے زبان سے ہو یا جسم سے ہر حالت اور ہر گھڑی مستعد اور چاق و چوبند رہنے والے محمد علی سیاست کو بھی ملکی خدمت کا رنگ دیتے تھے۔ جو شخص ایسے حالات میں پرورش پائے جس کا مسلک ملی سیاست ہو جس کی نظر کے سامنے وطن کے حالات واضح کتاب کی مانند ہوں ملک و دین کا خادم اگر سیاست پر عمل پیرا نہ ہو تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی اور محمد علی جیسی شخصیت پر یہ زیادتی روا نہ رکھی جا سکتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب غدر کے بعد ہندوستان کی حالت حد درجہ سقیم ہو گئی تھی ۔ غدر میں شریک ہندو اور مسلمان دونوں تھے دونوں اقوام نے حسب استعداد اس میں حصہ لیا غدر ختم ہوا تو حالات نا گفتہ بہ ہو گئے ۔ کایا پلٹ گئی جو حاکم تھے محکوم بن گئے ۔ ہندوؤں کی ذہنیت نے پلٹا کھایا انہوں نے گورنمنٹ سے پورا تعاون کیا ۔ انگریزی تعلیم انہوں نے حاصل کی سرکاری اسامیوں پر انہوں نے سایۂ ھما سمجھا اس کے برعکس مسلمان حکومت سے برہم تھے ۔جنہوں نے تاریخ کے رخ بدل ڈالے تھے ایسے حالات میں سرسید نے علم اصلاح وتفسیر کی نئی روح پھونکی لوگوں میں نیا جوش و ولولہ پیدا کیا اور پھر مولانا محمد علی کا دور آیا تو انہوں نے اس قوم میں حریت و آزادی کی لہر دوڑا دی۔ وہ ہندوستان کو انگریزوں کے پنجہ سے رہائی دلانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستانی ہونا ہی بڑی بات تھی۔ ہندو مسلم کی تمیز نہ تھی۔ ان کا دل حب ملی سے لبریز تھا۔ آزادی کے خواہاں تھے۔ مولانا محمد علی ملک و بیرونِ ملک میں خصوصاً اسلامی دنیا میں جو حالات رونما ہو رہے تھے اس سے بہت متاثر ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنی علمی ادبی اور صحافتی زندگی کو وہ اہمیت نہیں دی جو انہوں نے حالات کے پیشِ نظر سیاست کی طرف اپنی پوری توجہ کو مبذول کر دیا۔

جنگ بلقان میں خدمات وطبی وفد

محمد علی کے کارنامے سیاست کے افق پر ستارے بن کر چمک رہے ہیں۔ ان میں سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان سے ایک طبی وفد بلقان بھیجنے میں بڑی سرگرمی ظاہر کی تا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی ہمدردی کا ثبوت مل سکے۔ جس وقت محمد علی نے یہ عزم کیا کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد بھیجا جائے ۔ اس وقت حالات نہایت نا ساز گار تھے اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی غیر معمولی اور بالکل منفرد قوتِ فیصلہ اور قوت عمل سے کام لے کر اس کا بیڑہ اٹھالیا اور دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ اسے اتمام تک بھی پہنچایا۔

جنگِ عظیم

۱۹۱۳ء میں جب جنگ بلقان شروع ہوئی اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت ہیجان جوش اور حرکت کا ظہور عمل میں آیا۔ ملک کا وہ طبقہ جو گورنمنٹ سے تعاون کرتا تھا اس نے بھی اپنی وفاداری بالائے طاق رکھ دی اور اپنی ہمدردی کا اظہار ترکانِ آل عثمان کے ساتھ کرنا شروع کیا۔ لکھنو کے مشہور بیرسٹر ممتاز حسن نے امین آباد میں ایک نہایت پر جوش درد انگیز اور فصیح و بلیغ تقریر کی۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ وہ مسٹر ممتاز حسن کی شعلہ نوائی سے بہت متحیر ہوئے اور اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے لیکن مسٹر موصوف نے نہایت جرأت اور ہمت سے کہہ دیا کہ یہ ایسا مذہبی معاملہ ہے جس میں مسلمانوں سے کسی قسم کی کمزوری کی امید نہ رکھی جائے ۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ مسلمانوں کے اس احساس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر انصاری کی یہ خواہش

ہوئی کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی وفد لے جائیں اور مجروحین ومقتولین کی جو خدمت ان سے بن آئے کریں۔ ۲

محمد علی سے جب انہوں نے اپنی اس قابلِ صد ستائش عزم کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بہت زبردست تائید کی اور آمادہ کیا کہ وہ اس کارِ خیر کو ضرور انجام دیں۔سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ سرمایہ ناپید تھا اور بغیر کافی سرمایہ کے یہ مہم اتمام تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس زمانے میں ترکانِ آلِ عثمان کی امداد و اعانت کے لئے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ''ہلال احمر'' کے نام سے انجمنیں قائم ہوگئی تھیں جن کا مقصد سرمایہ جمع کرنا اور ترکوں کو پہنچانا تھا کیونکہ گورنمنٹ نے بھی مسلمانوں کے جوش وخروش کو دیکھ کر اس کی اجازت دے دی تھی کہ یہاں سے انہیں مالی امداد بھیجی جاسکے اور آسانیاں بھی پیدا کر دی تھیں کہ اس راہ میں مشکلات جو آئیں ان میں کسی نہ کسی حد تک سہولت ہو۔ چنانچہ محمد علی نے یہ معاملہ دہلی کی انجمن ہلال احمر کے سامنے پیش کیا۔ مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت سمجھائی۔ وفد کی ضرورت اور اہمیت کی طرف اس کے ممبروں کی توجہ مبذول کرائی نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن نے پندرہ ہزار کی رقم منظور کی اور اس کے انتظامات کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ رقم اس وفد پر صرف کی جائے گی اور وفد بھیجا جائے گا۔لیکن یہ وعدہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تھا کہ انجمن نے اپنی رائے بدل دی اور براہِ راست ترکوں کو بھیجنے کے انتظامات کرنے لگے۔ محمد علی نے ہرچند سمجھایا مگر بے سود۔ میر محفوظ علی صاحب اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں کہ محمد علی نے جلسہ ہی میں مجھ سے پوچھا ہمارے پاس کتنی رقم ہے انصاری! میں نے طے کر لیا ہے کہ ان شاء اللہ مشن جائے گا اور ضرور جائے گا۔ میرے پاس دس (۱۰) روپے بھی ہوتے جب بھی میں ہمت نہ ہارتا۔تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو اور رقم کی فراہمی میرے ذمے'' ۳

اسی رات کو اپنے حدمت گار محمد حسین سے کہا '' جا کر میرے کمرے میں لیمپ جلا

دے'' کمرے میں جا کر کامریڈ کے لئے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے بھی مشن کے لئے چندہ کی وہ دل جلا دینے والی اپیل کی جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپوں کی بارش کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوئے ۔ اس طرح محمد علی نے اپنے کام کو اتمام تک پہنچا کر دم لیا۔ صبر و مستقل مزاجی سے کام لیا اور آخر کامیابی حاصل کی۔

۱۹۱۲ء میں جب دُوَل یورپ نے ترکی کو مالی دقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس کی کوشش کی تھی کہ وہ ایک ذلت آمیز صلح پر مجبور ہو جائے تو محمد علی نے اپنی پوری کوشش اس امر پر صرف کر دی کہ گورنمنٹ اس کی اجازت دے دے کہ ترکوں کی مالی امداد کی جا سکے اور جب اس میں کامیابی ہو گئی تو محمد علی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ترکی تمسکات کے حصص خریدیں اور اس مقصد عظیم میں انہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ ترکوں کی ایک جماعت نے ان مظالم کے خلاف ایک اپیل کی تھی'' مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو'' محمد علی نے اس کو اپنے اخبار میں بالا قساط شائع کیا جس کے سبب وہ تمام پرچے ضبط کر لئے گئے اور بالآخر دو ہزار روپے کی ضمانت پر آزادی ملی [۴]

کامریڈ کا اجراء

ملازمت سے تو مولانا محمد علی کا جی اچاٹ ہو ہی گیا تھا۔ اب ان کا ارادہ ایک اخبار کے اجراء کا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے طے کر لیا کہ وہ کلکتہ سے اخبار نکالیں گے۔ اگرچہ بعد ازاں ان کو بڑے بڑے عہدے پیش کئے گئے مثلاً سر مائیکل ایڈوائر کے ذریعے سے نواب صاحب جاورہ نے محمد علی کو وزارت پیش کرنی چاہی۔ دوسری طرف بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی انہیں اپنی ریاست میں چیف سیکرٹری کا عہدہ دینا چاہا مگر وہ طے کر چکے تھے کہ ملازمت نہیں کریں گے انہوں نے ان دونوں عہدوں سے انکار کر دیا اور کامریڈ کے اجراء کا انظام کرنے لگے۔

''سچ'' کے محترم ایڈیٹر نے بالکل سچ فرمایا'' کامریڈ کے ایڈیٹر کے لئے دینوی ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع موجود تھے۔ ہندوستان کا ذکر نہیں انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسیٔ ادارت اس کے لئے خالی تھی۔ مناصب سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اس کے لئے چشم براہ تھی۔ عزت و ثروت، اقتدار و وجاہت کے اصنام کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لبھایا لیکن اس کشتۂ عشق نے ماسوا کی جانب نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھا اور سارے راستے چھوڑ کر صرف ایک کا ہو رہا'' ۵ بڑی آرزوؤں اور تمناؤں بڑی کوششوں اور صبر آزمائیوں کے بعد بالآخر کامریڈ کلکتہ کے افق صحافت پر نمودار ہوا۔ ہاتھ بے تاب ہو کر بڑھے کہ کامریڈ کو حاصل کریں نظریں بے تا ب ہوگئیں کہ کامریڈ کے'' جنت نگاہ'' صفحات سے لطفِ دید حاصل کریں اور لوگوں نے دوڑ دوڑ کر کامریڈ کو لینا چاہا کہ کہٰں ادب و سیاست کے اس متاع گراں سے محروم نہ رہ جائیں حکومت ہند کا کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جس کے عمال نے ممبر اور سیکرٹری سے لے کر انڈر سیکرٹری تک کامریڈ نہ منگایا ہو۔ ۶ یہی حال صوبہ کے حکمرانوں اور ان کے مشیروں کا تھا۔

مسٹر میکڈ انلڈ کی قدر دانی

اسلنگٹن کمیشن جب ہندوستان آیا۔ تو مسٹر میکڈ انلڈ وزیر اعظم برطانیہ جو اس وقت پارلیمنٹ کے ممبر تھے ہندوستان تشریف لائے۔ لکھنو میں انہوں نے محمد علی سے ملاقات کی۔ ملاقات کے وقت اس کا بہ مسرت ذکر کیا تھا کہ وہ کامریڈ کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ اسی طرح اور بہت سے انگریز انشاپردازوں نے کامریڈ کو بہت سراہا اور اس کے حسن انشاء' اصابت رائے اور غیر معمولی مہارت زبان کا اعتراف کیا۔

غرض اس محیر العقول اور شاندار انداز میں کامریڈ چلتا رہا اور ملک اس کی قدر افزائی کرتا رہا تا آنکہ پریس ایکٹ کے منحوس ہاتھوں بند ہو گیا۔ ۷

کامریڈ کا دوبارہ اجراء

بیجا پور جیل سے رہائی کے بعد ایک سال گزرنے پر اکتوبر ۱۹۲۴ء میں محمد علی نے اپنی

صدارت کانگریس کے دوران دوبارہ کامریڈ نکالا لیکن اب ملک کی سیاست میں اتنا تغیر ہو چکا تھا۔ ان کے مشاغل میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا اور ان کی ذمہ داریاں اس قدر بڑھ چکی تھیں۔ نیز راجہ غلام حسین اور ولایت علی بنبوق جیسے یگانۂ روزگار رفقاء سے وہ محروم ہو گئے تھے کہ کامریڈ جیسا نکلنا چاہیے تھا ویسا نہیں نکال سکے اور اس کا خود انہیں بھی سخت احساس تھا لیکن عالم یہ تھا کہ وہ تنہا کامریڈ کا بار اٹھائے ہوئے تھے اپنے طور پر وہ بہت کوشش کرتے تھے کہ اس کی شان برقرار رہے اس میں تنوع پیدا کیا جائے اور وقت پر نکل سکے۔ لیکن انصاف شرط ہے۔ جو شخص مسلسل بیمار بھی رہتا ہو۔ یونٹی کانفرنس میں بھی شریک ہوتا ہو۔ ہندو مسلم فسادات کے موقع پر محل و ارادت پر بھی جسے پہنچنا پڑتا ہو۔ کانگریس کے جلسوں میں بھی جسے شرکت کرنا پڑتی ہو، نظام خلافت کے استحکام کی ذمہ داریاں بھی جس پر ہوں۔ غرض ہر قومی اور ملکی معاملہ میں اسے پیش پیش رہنا پڑتا ہو اور ہندوستان کا دورہ کرنا پڑتا ہو اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ 'Sub Aditer' نہ ملتا ہو تو اس سے یہ توقع غلط تھی کہ وہ سابقہ معیار پر کامریڈ نکالے۔ ۸ پھر بھی محمد علی اپنی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ کسی جلسہ کی صدارت کے لئے کسی مسئلہ کے حل کرنے کے لئے، کسی قضیہ کے تصفیہ کے لئے محمد علی باہر گئے۔ بلکہ جانا پڑا۔ کامریڈ کی تاریخ اشاعت قریب آگئی تو انہوں نے رات کی نیند حرام کردی۔ دن بھر جلسے میں تھکے ماندے آتے۔ رات بھر کامریڈ ''لیڈنگ آرٹیکل (Leading Artical) لکھتے۔ بہر حال انہوں نے اس اخبار کے لئے انتھک محنت کی۔

بلگام کانگریس کے موقع پر یہاں تک ہوا کہ برصرفِ زر کثیر اپنی ناداری وافلاس کے باوجود تار پر پورا مضمون بھجوایا۔ کچھ تار بابو کی غیر معمولی انگریزیت نے اور کچھ بعض اور حضرات کی کرم فرمائیوں نے دفتر ہی میں مضمون مسخ کر دیا۔ اب کامریڈ میں جو مضمون شائع ہوتا ہے اس میں اور تو سب کچھ ہے مگر وہی نہیں جو محمد علی نے لکھا تھا۔

محمد علی کی بی اماں سے غیر معمولی محبت تھی اس کا ہر شخص کو علم تھا لیکن احساس فرض کا

یہ نادر نمونہ ملاحظہ ہو کہ ان کا انتقال ہوا لوگ تعزیت اور شرکتِ جنازہ کے لئے آرہے ہیں تجہیز وتکفین کا سامان ہو رہا ہے لیکن محمد علی ہیں کہ ایک گوشہ میں روبھی رہے ہیں اور کامریڈ کے پروف کی تصحیح بھی کر رہے ہیں۔

التواء

بالآخران نا ساز گار حالات سے مجبور ہو کر محمد علی نے کامریڈ کی اشاعت اس امید پر ۱۹۲۶ء میں ملتوی کر دی کہ جب تک کوئی قابل اور مستعد سب ایڈیٹر نہیں ملے گا وہ کامریڈ کے اجراء کا خیال بھی دل میں نہ لائیں گے۔

ہمدرد

محمد علی نے کامریڈ کا اجراء کلکتہ سے کیا تھا اس لیے کہ وہ چاہتے تھے کہ اپنا اخبار حکومت ہند کے دار السلطنت اور مرکز سے نکالیں لیکن جب حکومت نے اپنا مرکز تبدیل کر لیا اور کلکتہ سے دہلی آگئی تو محمد علی نے بھی حکومت کا تعاقب کیا اور دہلی پہنچ گئے اور یہاں آکر انہوں نے ہمدرد کے اجراء کے انتظامات بھی کامریڈ کے ساتھ شروع کر دیے۔

سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ بیروت سے جو انہوں نے ٹائپ رائٹر منگوایا تھا وہ پورا نہیں تھا اور جب تک وہ مکمل نہ ہو جاتا اس وقت تک ہمدرد کا نکالنا مشکل تھا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہمدرد ہندوستان میں پہلا اردو اخبار تھا جو ٹائپ پر چھپا۔ حکیم اجمل خان نے اس سلسلہ میں یہ رائے دی کہ جب تک پورا اخبار نہ نکل سکے ایک دو صفحے ہی نکلال دیجئے اس سے آمدنی بھی ہو گی اور پبلک کی خدمت بھی۔ محمد علی نے اس رائے کو پسند کیا اور ہمدرد کا وہ سلسلہ خاص ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے جاری ہوا جسے عام طور پر ''نقیب ہمدرد'' کہتے ہیں۔ محمد علی کو شخصیت شناسی میں بھی ملکۂ تام حاصل تھا۔ ہمدرد کے اسٹاف میں چن چن کر انہوں نے ایسے آدمی رکھے جو محمد علی کی تربیت کی بدولت مختلف حیثیات سے روشناس خلق ہوئے ۔ ہمدرد کے

عملہ کا ایک ایک فرد اپنے وقت کا ایک بہت بڑا ادیب اور صحافی ہوا۔ مثلاً سید ہاشمی، قاضی عبدالغفار، سید جالب، مولوی عبدالحلیم شرر اور فاروق صاحب دیوانہ سب ہی ہمدرد کے دفتر میں موجود تھے۔

محمد علی کا نظریہ صحافت اور صحافت کا بلند معیار

ہمدرد کے ذکر کے سلسلہ میں نا مناسب نہ ہوگا کہ محمد علی کا وہ نظریۂ صحافت پیش کر دیا جائے جس پر عمل پیرا ہو کر ہمدرد نے ہندوستانی صحافت میں اپنے غیر فانی نقوش قائم کئے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ محمد علی بڑودہ میں برسرِ ملازمت ہیں۔ انشاپردازی اور مضمون نگاری کا جب جوش اٹھتا ہے تو ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں اپنے قلم کی روانی دکھاتے ہیں اور اس کے ایڈیٹر سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ خود ان کے دل میں بھی اس میدان میں آنے کی تمنا پرورش پا رہی تھی اور ملازمت کے جنجال سے جلد از جلد رہائی چاہتے ہوے کہتے ہیں

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی [۹]

اسی زمانہ میں گجرات سے ان کے ایک شناسا نظام الدین صاحب نے ایک اخبار نکالنا چاہا اور محمد علی سے مشورہ طلب کیا۔ محمد علی نے مشورہ کی صورت میں صحافت کے یہ زریں اصول ان کی خدمت میں پیش کئے۔[۱۰]

۱۔ ذاتیات سے بالکل مبرّا ہو نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

۲۔ کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو مخالفت محض رائے تک ہو۔

۳۔ جو کچھ لکھا جائے عبارت آرائی کے خیال سے نہیں نہ لوگوں سے چٹکیاں لینے کی غرض سے بلکہ متانت اور سنجیدگی سے۔

۴۔ جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں اگر اس سے زیادہ کوئی لوکل اور باہر کی خبریں چھاپنی ہوں تو

اس کے راوی کا ثقہ ہونا سب سے ضروری ہے۔

۵۔ اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہو۔

۶۔ اخبار خبروں کا مجموعہ ہے لہٰذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہیے۔

۷۔ مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو ایسے مضمون پر جو اس زمانہ میں زیر بحث ہو۔

۸۔ ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر رائے زنی کے لئے ہے۔ اسی کام میں آنا چاہیے۔

۹۔ ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہیے خواہ وہ کسی خبر سے متعلق ہو یا مستقل مضمون پر۔

۱۰۔ خطوط وہی چھاپے جائیں جو کسی ضرورت کے تحت لکھے گئے ہوں نہ کہ نامہ نگار کی جو دستِ طبع کے لئے۔

۱۱۔ اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرا و مبرا ہو۔

۱۲۔ ایڈیٹر کو تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں و کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔

مولانا نے مزید لکھا ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر کس قدر محنت کرتا ہے نیز اپنی مثال دی اور کہا خود مجھے عصر کے متعلق کچھ لکھنا ہے تو روزانہ اخبارات سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ مگر تین چار کتابیں شروع سے آخر تک جب تک نہ پڑھی جائیں ایک دو کالم کا مضمون تیار نہیں ہوتا۔ اگر قلم برداشتہ لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کے لئے بہت مشکل۔[۱۱] محمد علی نے ہمدرد جس شان سے چلایا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اپنے اس قابل رشک کارنامہ کی داد ہمدرد نے گورنمنٹ سے بھی حاصل کر لی۔ ہمدرد پر جنگ کے بعد سنسر بٹھا دیا گیا اور بغیر اس کی منظوری کے کوئی مضمون یا خبر شائع کرنا جرم قرار دے دیا گیا۔ آخر محمد علی کی نظر بندی پر ہمدرد کی اشاعت ملتوی کرنا پڑی۔[۱۲]

ہمدرد کا دوبارہ اجراء

بے جاپور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی نے کامریڈ کے ساتھ ہمدرد کی زمام ادارت بھی اپنے ہاتھ میں لی۔ عہد ثانی کو عہد اول سے عمدہ ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ محمد علی کے ذہن و دماغ پر جو حملے ہوئے انہوں نے ان کے متاعِ اطمینان وسکون کو درہم برہم کر دیا اور وہ فروغِ خاطر کے ساتھ ہمدرد کو بھی نہ چلا سکے۔ ہمدرد کی مالی حالت خراب تھی وہ اسے بند کر دینا چاہتے تھے مگر دو دوستوں عبدالماجد دریا آبادی اور ظفر الملک علوی مدیران ''الناظر'' نے انتظامی نقائص کو دور کرنے کی ذمہ داری لے کر اسے بند ہونے سے بچائے رکھا۔

مسلم لیگ

غدر کے بعد سے مسلمانوں نے سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس وقت مسلمان حکومت کے ظلِ عاطفت کو سایۂ الٰہی سمجھ رہے تھے اور کسی ''باغیانہ'' تحریک میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں تھے جس سے حکومت کسی قسم کا شک کرتی لیکن یہ ظاہر ہے حالات ہمیشہ تو قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ حکومت کے گوشۂ چشم التفات میں تبدیلی ہوئی۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی علی الاعلان ظاہر ہوئی تو مسلمانوں میں بھی احساس پیدا ہوا اور یہ احساس اس جماعت کی طرف سے پیدا کیا گیا جو سید عالی مقام کی جانشین تھی اور سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اس سے ہر وقت بے تعلقی اور بے زاری کا اعلان کرنا اپنی بہترین ملکی خدمت سمجھتی۔

مسلم لیگ کی تاسیس

اسی جماعت نے نواب وقار الملک بہادر اور نواب محسن الملک مغفور کی کوشش سے ۱۹۰۶ء میں جب بہ مقام ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی وہیں ایک گوشہ میں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی زندگی کی تشکیل کے لئے ایک سیاسی جماعت کی تعمیر کرنا تھی۔ اور پھر یہ قائم ہوگئی اس نے مسلم لیگ کا نام پایا۔[۱۳] محمد علی نے اس کی تاسیس اور اس کے استحکام میں نمایاں حصہ

لیا اور اس طرح اس کے بانیوں میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔ اس موقعہ پر باوجود یہ کہ اسلامی ہند کی قابلیت کا خطرہ موجود تھا مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد و ضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی نے کیا۔ ان میں جوش اور جذبہ کی کمی نہیں تھی لیکن ان کے رہنما جوش اور جذبہ سے محروم تھے۔ مسلم لیگ کا نصب العین کانگریس کی طرح صرف یہ تھا کہ حکومت کے زیر سایہ اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ طلب کرتے۔ لیکن محمد علی کی شرکت نے رفتہ رفتہ مسلم لیگ کو ایک حریت خواہ جماعت بنا دیا۔ جب محمد علی کو عملی شرکت کا موقعہ حاصل ہوا تو انہوں نے لیگ کے قالبِ بے جان میں ایک روح پیدا کرنی چاہی ایسی روح جو دوسروں کو ہوشیار کر سکے اور بیداری پیدا کر سکے لیگ کے نصب العین کی پستی کا انہیں احساس تھا اور اس کے لئے انہوں نے انتھک کوششیں کیں بالآخر خدا وندانِ مسلم لیگ نے بھی اس حقیقت کا احساس کیا اور انتہائی شجاعت و مردانگی کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا کہ اب مسلم لیگ کا نصب العین ہندوستان کے مناسب حال سیلف گورنمنٹ ہے۔ محمد علی اس کے لئے میدان میں اتر آئے۔

قوم کی راہنمائی کا پہلا امتحان

دسمبر ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخوں میں مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے والی کمیٹی اور کانفرنس کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام ایک اہم قومی مسئلہ تھا۔ اس وقت تک قومی راہنماؤں اور عوام میں کوئی خاص ربط نہ تھا۔ جمہوریت کا دور ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ عوام کا کام صرف تقریریں سننا اور بولنے والوں کی فصاحت کی داد دینا تھا۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کا قیام ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جسے مسلم عوام خود طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ بالآخر محمد علی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو سارا مجمع انتظار کی تصویر بن گیا۔ محمد علی کی تحریر کا لوہا تو سارا ہندوستان مانے ہوئے تھا لیکن ابھی تک ان کی تقریر کی کوئی شہرت نہ تھی۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے تو ان کا سکہ سارے ملک میں رواں تھا لیکن لیڈر کی حیثیت سے انہیں بہت کم جانتے تھے۔ اس موقع پر آپ

نے اپنے خیالات کو بالکل سادہ لفظوں میں اور اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ تقریر جس قدر کامیاب ہوئی اس کی توقع خود لیڈر کو بھی نہ تھی۔ محمد علی لیڈری کے پہلے امتحان میں کامیاب نکلے تو اس دن سے آپ کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔[۱۴]

ہنگامۂ کانپور

۱۹۱۳ء میں کانپور کی میونسپلٹی کی طرف سے ایک سڑک کی تعمیر ہو رہی تھی ایک مسجد سنگِ راہ بنی ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے اس مجوزہ ''صراطِ مستقیم'' میں کجی پیدا ہو رہی تھی۔ مسجد کے متولیوں نے غایت درجہ دریا دلی اور رواداری کے ساتھ میونسپلٹی کو اس کی اجازت دے دی کہ راستہ میں مسجد کے غسل خانے اور بیت الخلا کے جو سنگِ گراں حائل ہیں انہیں ہٹا دیا جائے۔ میونسپلٹی کو موقع مل گیا اور اس نے انہیں منہدم کرانے کے انتظامات شروع کر دیئے۔ عامتہ المسلمین، جمہور علماء اور ہندوستان کے تقریباً تمام بزرگوں نے اس کے خلاف اظہار رائے کیا اور متولیوں کی اس غلط فہمی کو رفع کرانا چاہا کہ وہ اپنی کسی جائیداد کے متعلق تو اتنا ضیافانہ اعلان کر سکتے ہیں لیکن مسجد کے معاملہ میں نہیں۔ یہ تمام ہنگامہ اور شور وغل بے کار ثابت ہوا۔ مسجد کا وہ حصہ منہدم کرادیا گیا۔ اس پر مسلمان بھڑک اٹھے باوجود حکومت کی مداخلت کے وہ اسکے خلاف مظاہروں سے باز نہ آئے۔ محمد علی نے اس واقعہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا انہوں نے گورنر صوبہ متحدہ سے نجی طور پر خط وکتابت کی مگر وہاں کامیابی نہ ہوئی تو پھر انہوں نے بمبئی جاکر مسٹر میکڈ انلڈ کو تار دیا اور ان سے اس معاملہ کو سمجھنے کی درخواست کی مگر وہ خاموش ہو رہے۔ اس پر محمد علی نے مسٹر وزیر حسن سیکٹرٹری مسلم لیگ کو ہمراہ لیا اور انگلستان پہنچ گئے۔ وہاں خوب تقریریں کی۔ پروپیگنڈہ کیا۔ آخر ان کی کوشش بار آور ہوئیں سر جیمس لاٹوش سابق گورنر صوبہ متحدہ محمد علی کے بیان سے متاثر ہوئے۔ لندن سے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو ہدایت بھجوائی گئی انہوں نے بطورِ خود اس معاملہ کا تصفیہ اس طرح کیا کہ کانپور پہنچے۔ ان جھگڑوں میں

زخمی ہونے والوں کو ہسپتال جا کر دیکھا۔ جیل میں قیدیوں کا معائنہ کیا اور انہیں رہا کر دیا۔ مسجد کو ازسرِ نو تعمیر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔۱۵

"The Choice of The Turks"

۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی اس وقت لندن ٹائمز نے ایک اشتعال انگیز مضمون"The Choice of the Turks" اخبار میں شائع کیا تھا۔ اور ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صرف اور صرف دور سے تماشا دیکھیں اس جنگ میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ یونان پر بھی ان کی پیش قدمی نہ ہو۔ مضمون حددرجہ اشتعال انگیز اور دل شکن پیرایہ میں لکھا گھا تھا۔ جس سے ترکوں کی سخت توہین اور حقارت مقصود تھی اگر چہ اس زمانہ میں بیگم محمد علی بہت علیل تھیں اور اس فکر و پریشانی میں محمد علی کی رات، رات بھر جاگتے گزرتی تھی مگر اس جوش کو قابو میں نہ رکھ سکے جو اس مضمون کو دیکھنے سے ان میں پیدا ہوا انہوں نے اس کے جواب میں ایک مضمون لکھا جس کے بارے میں کہتے ہیں۔

I had sat up for fourty hours to write twenty fateful columns, forgoing sleep and rest and almost all food, except some very strong cafee which I seldom use to take"16

یہ مضمون گورنمنٹ کے حلقوں میں اس قدر نا پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا کہ چند ہی روز میں اس کا نتیجہ بھی نکل آیا یعنی ہمدرڈ کا مریڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ لیکن محمد علی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ انہوں نے اس حکم کی آسانی کے ساتھ تکمیل نہیں کی بلکہ اس فیصلے کے خلاف اپیل کی اور لطف یہ کہ اس مقدمے کی پیروی خود کی اور جرح کی۔ اور خود اس حکم کے پرزے بارگاہِ عدالت میں اڑائے۔ دورانِ بحث میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ اور ہر شخص دم بخود تقریر سن رہا تھا۔ محمد علی باہر نکلے تو ہندو مسلمان وکیل و بیرسٹر کی زبان سے بیک وقت یہ نکلا'' محمد علی کاش آپ بیرسٹر ہوتے'' محمد علی نے جواب دیا'' اب جو کچھ ہوں اس کی کون سی قدر ہو رہی ے جو بیرسٹری میں ہوتی''

اس طرح بالآخر آپ کی ضمانت ضبط کر لی گئی اور کامریڈ موت کی آغوش میں چلا گیا۔

نظر بندی

مستحق دار کو حکمِ نظر بندی ملا کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی ۱۷

ضبطیٔ ضمانت کے بعد محمد علی نے پھر ذیابیطس کی شکایت محسوس کی ، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم اجمل خان نے فوراً سارے دماغی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ محمد علی رام پور گئے کہ وہاں تبادلہ آب و ہوا کا خیال بھی تھا اور وطن کی کشش بھی رام پور پہنچے ہی تھے کہ ڈائرکٹر جنرل پولیس صوبہ متحدہ نواب صاحب رام پور کے پاس آئے اور نواب صاحب کی معرفت آپ طلب کئے گئے۔ وہاں سے کانپور کے قضیہ کے متعلق سوالات کئے گئے اور اس دوران میں سخت گفتگو ہوگئی۔ اب آپ نواب صاحب کی اجازت کے بغیر رام پور سے نہیں جا سکتے تھے۔ گویا دوسرے معنی میں آپ نظر بند کر دئے گئے۔ غالباً ۱۴۔ گھنٹہ کی پر لطف نظر بندی کے بعد آپ رہا ہوئے۔ اس کے بعد آپ نینی تال کی گھاٹیوں میں شکار کھیلنے گئے تو واپسی پر سخت بخار میں مبتلا ہوئے۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری ہی نے نینی تال میں موسم گرما بسر کرنے کے لئے مکان وغیرہ کا انتظام کیا۔ آپ کی علالت کی خبر سن کر مولانا شوکت علی دہلی سے رام پور آگئے اور دونوں بھائیوں کا ارادہ حسبِ دستور حضرت معین الدین چشتیؒ کے سالانہ عرس پر اجمیر شریف جانے کا تھا۔ ابھی انہیں وہاں گئے دو ہی روز گزرے تھے کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ایک جابرانہ حکم ۱۷۔ مئی کو قانون تحفظ ہند کی رو سے آپ کو دیا گیا کہ ''آپ مع اپنے برادرِ محترم اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں''۔ اس حکم کی رو سے آپ پر وہ تمام پابندیاں عاید کر دی گئیں جو جرائم پیشہ پر بھی عاید نہیں کی جاتیں۔ یہ ایک صریح زیادتی تھی مگر محمد علی نے یہ حکم پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور کہا '' یہ ایک پیغمبرانہ سنت ہے جس کی ادائیگی کے لئے خدائے حکیم نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے منتخب کیا'' ۱۸ ان احکام نادری کے بعد محمد علی حسب الحکم مھرولی چلے گئے۔ اہالیان دہلی نے آپ کو بڑے جوش و خروش بھرے دلوں سے

رخصت کیا۔[۱۹] علی برادران کی گرفتاری کے بعد ایک اہم سوال پیدا ہوا آخر ان لوگوں کا جرم کیا ہے جس کی بنا پر قید بے میعاد بھگتنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔[۲۰] مھر ولی سے ان دونوں بھائیوں کو لینڈون بھیج دیا گیا اور وہاں ان کی آزادی بالکل سلب کر لی گئی اور محمد علی کے قلم پر سنسر شپ قائم کر دی گئی۔

چند واڑہ

چند واڑہ وسطِ ھند میں ایک چھوٹا سا مقام ہے اپنے وطن سے دور اس جگہ بند ہو کر بھی محمد علی بیکار نہ بیٹھے۔ دونوں بھائیوں نے ایامِ اسیری کو غنیمت جان کر تاریخ عالم اور مذہب اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ چندواڑہ کی نظر بندی کے ایامِ اسیری میں علی برادران نے وہاں کے لوگوں میں مذہبی روح پیدا کی ۔ چندواڑہ میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی اس زمانے میں اس مسجد میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ مسلمانان ہند اپنے محبوب رہنماؤں کی اسیری پر حددرجہ مضطرب تھے اور جو امکانی کوششیں وہ کر سکتے تھے انہوں نے کیں۔[۲۱]

مسلم لیگ کی صدارت

ستمبر ۱۹۱۷ء میں نظر بندی کے تقریباً اڑھائی سال بعد محمد علی کو مسلمانانِ ہند نے اپنی غیر معمولی محبت اور قربانی کے ثبوت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے منتخب کیا۔ آپ نے اسی کے متعلق فرمایا۔

؎ یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے۔ [۲۲]

لیکن گورنمنٹ نے انہیں جلسے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی ان کی بجائے ان کی والدہ بی اماں موحومہ نے شرکت کی اور کرسیٔ صدارت پر محمد علی کی تصویر رکھی گئی۔ [۲۳]

اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور قائد سیاسی مسٹر تلک نے ایک ریزولیشن کانگریس میں پیش کیا جس میں علی برادران کی فوری رہائی پر گورنمنٹ ہند کی عنان توجہ مبذول کرنے کی سعی ناکام کی گئی۔ اسی عرصہ میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اصلاحات کے

لئے ابتدائی تحقیقات کرنے ہندوستان آئے ملک کے تمام سیاسی لیڈروں نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ محمد علی نے بھی ملاقات کی مگر حکومت ہند کو ناپسند ہوئی۔ بعد ازاں مسلمانوں کا ایک وفد ان سے ملاقات کرنے گیا اور مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی علی برادران کی رہائی کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ لیکن وفد کو اسی صورت میں مسٹر مانٹیگو سے ملنے کی اجازت ملی کہ وہ اس مسئلے کو خارج کردیں۔ وفد نہ مانا اور اس کو نامنظور کر دیا گیا۔ ۱۹۱۸ء میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ ان کے معاملے پر غور کر کے رپورٹ پیش کرے۔ انہوں نے نظر بندی کو بالکل جائز قرار دیا لیکن سفارش کی کہ سزا کافی ہو چکی ہے اس لئے انہیں رہا کر دیا جائے۔ لیکن حکومت نے منظور نہیں کیا۔۲۴

زندان کی تبدیلی

چندواڑہ کئی سال سے ان کا وطن ہو گیا تھا۔ مگر اب اس کو بھی چھوڑنا پڑا ان دونوں بھائیوں نے کوشش سے وہاں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ بروز جمعہ محمد علی نے یہاں پر جوش تقریر کر ڈالی حکومت کو یہ ناگوار گزرا اور انہیں بیتول جیل منتقل کر دیا۔

علی برادران جیل ہی میں تھے کہ گاندھی نے رولٹ بل کے خلاف تحریک سول نافرمانی شروع کی۔ تمام ملک میں جوش آزادی کی آگ بھڑک اٹھی اور حکومت نے جتنا زیادہ تشدد کیا اتنا ہی یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ اس عرصہ میں جلیانوالہ کا قتل عام ہوا۔ خطرہ تھا کہ تحریک کہیں مسلح بغاوت کی صورت نہ اختیار کر لے اس لئے گورنمنٹ نے اس غصہ کی لہر کو روکنے کے لئے ایک مدبرانہ چال چلی یعنی سب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح یہ دونوں بھائی بھی رہا ہو گئے۔۲۵ اس وقت امرتسر میں تمام سیاسی جماعتوں کے اجلاس ہو رہے تھے۔ یہ امرتسر گئے اور ان میں شرکت کی۔ محمد علی نے کانگرس کے اجلاس میں یادگار تقریر کی۔ خلافت کانفرنس میں بھی ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ بعد ازاں جب یہ دہلی آئے تو نہایت پرتپاک و پرجوش استقبال ہوا۔

Round Table Conference

گول میز کانفرنس

سائمن رپورٹ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی اس میں اعتراف کیا گیا تھا کہ ۱۹۱۷ء کے بعد ہندو مسلم مسئلہ زیادہ نازک ہو گیا ہے اور اس کے حل کے لئے تجاویز پیش کی گئیں تھیں۔ اس اثناء میں انگلستان میں لیبر وزارت برسرِ اقتدار آچکی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ تمام ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس لندن میں بلائی جائے جہاں برطانوی حکومت ان سے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر گفتگو کر سکے۔ ۲۶

محمد علی نے اپنی علالت کے باوجود یہ طویل زحمت سفر کیوں اختیار کی اور کیوں نہ لندن جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن محمد علی کے لئے اس کے سوا چارا کار کیا تھا؟ کانگرس کی جو روش تھی اس سے وہ مایوس ہو چکے تھے۔ گول میز کانفرنس کے لئے جن مندوبین کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو محمد علی کی طرح قوم کا درد اپنے دل میں رکھتا ہو۔ یا محمد علی کے خیالات و معتقدات سے اتفاق رکھتا ہو۔ اس لئے بجا طور پر انہیں یہ خیال تھا کہ گول میز کانفرنس میں بغیر ان کی شرکت کے مسلمانوں کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی۔ اپنے ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنے مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی میں بھی کیا تھا۔ لوگوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا، نشیب و فراز کی طرف رہنمائی کی، صحت کے خطرات سے آگاہ کیا۔ سب جتن کئے مگر محمد علی جو عزم کر چکے تھے اس سے انہوں نے رجوع نہیں کیا ان کو تو اس پر عمل کرنا تھا۔ ۲۷

محمد علی کی خبر روانگی جب مشہور ہوئی تو بمبئی کے بعض حریانِ حریت نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ مندوبین گول میز کانفرنس کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ الوداع کہیں گے اور اس کے انتظامات بھی مکمل ہو رہے تھے اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ مندوبین کی روانگی کے روز مظاہرہ کیا جائے گا۔ مسلمانان بمبئی اس خبر سے سخت مشتعل ہوئے وہ اسے کسی طرح برداشت نہ کر سکتے

تھے کہ ان کے محترم رہنما کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ الوداع کیا جائے ۔ انہوں نے بھی پورے طور سے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے اس سردار کو پھولوں اور ہاروں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ الوداع کہیں گے خواہ اس میں تصادم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اس خبر وحشت اثر نے مخالفین کے کیمپ میں تہلکہ مچا دیا اور مجبوراً یہ ارادہ فسخ کر دینا پڑا ۔محمد علی بجائے سیاہ جھنڈیوں کے اپنے بہت سے مخلصوں اور عقیدت کیشوں کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ جس وقت مولانا محمد علی لندن پہنچے تو وہ سخت بیمار تھے لیکن انہوں نے اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر مستعدی و کارگزاری کی انتہا کر دی۔ وزراء امراء اور مدیرانِ جرائد سے مسلسل تبادلۂ خیالات کیا۔ انہیں ہندوستان کے حالات بتائے سیاسی پیچیدگیاں سمجھائیں۔ ہندو مسلم اختلافات کی سیاسی اہمیت بتلائی ۔غرض تمام حالات آئینہ کر کے رکھ دیئے۔

مولانا محمد علی میں جب تک سکت رہی وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے ٹیلی فون کرتے رہے معاملہ اہم ہوا تو اپنے ''غم خانہ'' میں کبھی لارڈ سینکے (Sankey) سے شوکت صاحب کی مخالفت کے باوجود گفتگو ہو رہی ہے کبھی مسٹر بن (Benn) وزیر ہند سے کبھی سر اکبر حیدری سے اور کبھی سر احمد سعید سے تا آنکہ 'بیماریٔ دل' نے کام تمام کر دیا۔ اور ملتِ اسلامیہ اپنے عظیم المرتبت پیشوا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔

گول میز کانفرنس کی تقریر کے بعد سے محمد علی کی حالت جو گری تو پھر نہیں سنبھلی اور اس کا کوئی امکان بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وفات کی شب بلا سے پیشتر وہ رات بھر کام کرتے رہے ۔ ہندو مسلم تعلقات پر جو انہوں نے ایک مفصل سکیم تیار کی تھی اس کا مسودہ ٹھیک کراتے رہے اور وزیراعظم کے پاس اسے بھیجنے کی فکر کرتے رہے۔ حالت بظاہر تشویش انگیز نہیں تھی کہ ان کی جان کا خطرہ کیا جاتا اسی لئے شوکت علی ایک دوست سے ملنے آئر لینڈ تشریف لے گئے تھے ۔لیکن اپنی اس سکیم کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے اور کئی گھنٹہ کی بے ہوشی کے بعد صبح کو کچھ دیر کے لئے آنکھ کھلی۔ اس وقت تھکا ماندہ بوڑھا بھائی بھی پہنچ چکا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے محمد علی

کی روح عالمِ بالا کو سدھاری اور یہ ۴۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی ایک غم ناک صبح تھی۔

ولادت تو مادرزاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی ۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا۔ سنگین اور صالح ۔ محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتادِ طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے۔ صحیح اور گراں مایہ۔

قضا کس کو نہیں آتی یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے [۲۸]

مسئلہ تدفین

اس وقت زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ لاش دفن کہاں کی جائے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ تدفین لند ن میں ہونی چاہیے لیکن گھر والے اس کے خلاف تھے ۔ بیگم محمد علی انہیں ہندوستان لے جانا چاہتی تھیں اور خود ہندوستان سے سینکڑوں تار پہنچے کہ نعش یہاں لائیے تا کہ ہم تشنہ کامانِ زیارت آخری دیدار ہی سے مشرف ہو جائیں۔ رام پور نے یہ استحقاق پیش کیا کہ اسے محمد علی کا وطن ہونے کا فخر حاصل ہے ۔ لکھنو نے یہ حق باصرار پیش کیا کہ اس سے بڑھ کر اس امانت کا حقدار کوئی نہیں ہوسکتا۔ اجمیر نے استدعاء کی کہ محمد علی کو سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ سرہ کے سایۂ ہما میں آخری موقعۂ استراحت ملنا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ خود محمد علی کو درگاہِ خواجہ سے بہت عقیدت تھی۔ علی گڑھ آگے بڑھا اور کہا کہ محمد علی کے ذہن و دماغ کی نشوونما یہیں ہوئی۔ دلی ایک سوگوارانہ انداز سے یوں گویا ہوئی کہ محمد علی یہیں چہکے پھلے پھولے اور کامران ہوئے۔

لیکن بیت المقدس کی سرزمین نے اپنے مقدس بازوؤں کو پھیلایا اور محمد علی سے کہا" تیری ساری زندگی اور ساری جدجہد، تیری دوستی اللہ کے لئے تھی، دیکھ یہ برگزیدہ انبیاء و مرسلین

کے جسد پاک اور بے شمار اولیاء ومقبولین کے اجسام مطہرہ میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آ میں تجھے ایک گوشۂ عافیت اور اسی سرزمین امن وسلام کا دیتی ہوں بول منظور ہے؟ محمد علی کی روح مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ مسجد عمر نے اپنا سینہ شق کیا اور محمد علی اس میں سما گیا۔ کیا قسمت تھی!

''یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا''
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے [۲۹]

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت وکیفیت میں دو متضاد چیزیں موجود تھیں۔ جو شاذ و نادر ہی کسی میں جمع ہوتی ہیں۔ یعنی شجاعت و رقت قلب۔ ان کی بہادری کا تو یہ عالم تھا کہ برطانوی حکومت سے بے جھجک ٹکر لے رہے ہیں جب کہ قید و بند اور پھانسی کا تختہ سامنے تھا۔ اور اسی کے ساتھ ہی رقتِ قلب کا یہ عالم کہ تقریریں کرتے کرتے رو دیتے تھے اور جب کبھی ملت کے زوال اور بربادی کا ذکر چھڑ جاتا تو فوراً آنکھیں نم ناک ہو جاتیں۔ جرأت و بے باکی کا یہ عالم تھا کہ طلب آزادی کی خاطر جب انہوں نے انگلستان کا آخری سفر کیا اور پارلیمنٹ میں اپیل کی تو شہنشاہ جارج پنجم کو بے دھڑک خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اگر وکٹوریہ کا بیٹا مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دے سکتا تو مرنے کے لئے ڈیڑھ گز زمین تو انگلستان میں دے سکے گا'' خود ان کے لئے الفاظ واقعہ بن گئے اور اسی شب انگلستان میں وفات پا گئے۔ حق تعالیٰ نے ان کے الفاظ کو ایسا قبول فرمایا کہ ابدی طور پر مقبولین کی معیت میں انبیاءؑ کے جوار میں دفن کئے گئے یہ جہاں ان کی قبولیت عنداللہ کی دلیل ہے وہیں ان کی پاک طینت کی بھی مظہر ہے۔ [۳۰]

مولانا بلا کے ذہین تھے۔ دشمن و دوست ان کی فراست کو مانتا تھا۔ محمد علی ہر وقت ذہنی طور پر مستعد تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ذہانت مضمر تھی۔ اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر قوم کی بہی خواہی کے لئے دعائیں کرتے۔ روتے روتے ہچکیوں کی آواز اتنی تیز ہوجاتی کہ

خواب گاہ سے باہر تک سنی جاتی تھی۔ وہ ایک اچھے مسلمان تھے صحیح العقیدہ اور پابند اعمال خوش اخلاق، ہنس مکھ اور شفیق تھے۔ وہ بہترین خطیب تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں کے اعلیٰ انشا پرداز تھے۔ دونوں زبانوں کے بہترین سخن سنج اور سخن فہم، اچھے مقرر اچھے شاعر اور درویش طبع انسان تھے۔ وہ حاتم طائی کی طرح سخی تھے اور حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح بے درہم و دینار تھے۔ وہ عالموں کی طرح عبا پہنتے تھے اور عابدوں کی طرح عبادت کرتے تھے۔ قرآن پاک انہوں نے جیل میں حفظ کیا۔ ان ساری خوبیوں کے ساتھ وہ یوں معلوم ہوتے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اہل کمال کے پورے ایک شہر کو محمد علی کی ذات میں سمو دیا ہے۔

محمد علی کا دل و دماغ اپنی قوم کی بہتری کے لئے ہر وقت سرگرمِ عمل رہتا۔ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جو قوم کے غم کو غم ضرور سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو اس غم کو خون میں جذب کر لیتے ہیں۔ محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اجتماعی غم کو ذاتی غم بنا لیا۔ جو جنگ بیرونی دنیا میں جاری تھی وہی نقشہ ان کے دل میں تھا۔ وہی کیفیت ان کے دل میں تھی۔ گویا کہ ان کا دل ایک سٹیج کی حیثیت رکھتا تھا جس پر بیرونی ڈرامہ محمد علی کا ذاتی ڈرامہ بن کر نکلا جا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ غم جب حد سے سوا ہو جائے تو انسان سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر مذہب میں انسان پناہ لیتا ہے۔ لیکن محمد علی نے مذہب سے پناہ یا مذہب میں پناہ لینا نہ چاہی بلکہ اس کا آسرا لیا۔ اسی آسرے کے سہارے انہوں نے اپنی بے پناہ جوشیلی طبیعت کو سنبھالا۔ انہوں نے مذہبی صداقتوں کو بطور ذہنی اور فکری استحکام اور سیاسی استقامت کو استعمال کیا۔ ان کے پریشان کن حالات نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی شخصیت کو اس راہ پر لے آئیں۔ رنج و غم نے ان کے دل میں نرمی و گداز کی کیفیت پیدا کر دی پہلو میں قوم کا درد ٹیس بن کر اٹھنے لگا۔ اس رجحان نے ان کی باتوں کو شعری رنگ عطا کیا۔ دل کا درد اگر چہ قومی درد تھا مگر اس کے اثرات یوں ظاہر ہوئے گویا کہ وہ ان کا ذاتی زخم اور ذاتی درد تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں کیا۔ اس غم نے جس کو انہوں نے ذاتی نوعیت کا درد سمجھ کر روح میں رچا لیا وہی غم انہیں مسٹر محمد علی سے مولانا محمد علی بنا گیا۔

وہ ایک ایسی ہستی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی شمال میں بھی گونجی اور جنوب میں بھی بلند ہوئی۔ ہمالہ کی بلندیوں نے بھی اسے سنا اور گنگا کی گہرائیوں نے بھی اسے محسوس کیا۔ پڑھے لکھوں نے بھی اسے سمجھا اور جاہلوں نے بھی اس کے رسیلے پن کو دل میں جگہ دی۔ عالموں نے بھی، جاہلوں نے بھی بڑوں نے بھی، اور چھوٹوں نے بھی، سرداروں نے بھی، خاکساروں نے بھی۔ شہر کے شرفاء نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی، جیل خانے کی تنگ و تاریک کال کوٹھریوں نے بھی، راجوں مہاراجوں کے قصر والوں نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے ہوئے جھونپڑوں نے بھی۔

اس کا کلام سن کر ڈرائنگ روم کے صوفے اور کوچ کھکھلا کر ہنسے۔ اس کا پیغام سن سن کر مسجدوں کے محراب و منبر بلبلا بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں اور مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر اور ویرانے، قوم پردازوں کی کانگریس اور فرقہ پردازوں کی کانفرنس پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمیعۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقشِ قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز۔ اس دل و دماغ کا ایسا جامع الصفات سردار کبھی قوم کی خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے۔ جنہیں یہ نعمت ملی انہوں نے قدر نہ کی۔ وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے۔ دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا روکنے والی تھی۔ آنی دولت تھی اور فانی نعمت تھی آئی اور گئی۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے [۳۱]

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال؛ ص۔۴۴۲ خزینۂ ادب، لاہور

۲۔ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی؛ص۔۲۵۹، اتحاد پریس، لاہور، ۱۹۵۰ء

۳۔ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی؛ ص۔۲۶۰

۴۔ ایضاً، ص۔۲۶۱

۵۔ ایضاً، ص۔۲۶۴

۶۔ احمد عباس، محمد علی جوہر سوانح حیات، ص۔۱۰،۱۱، کتاب گھر دہلی، ۱۹۳۶

۷۔ جعفری، سیرت محمد علی؛ ص۔ ۲۲۸

۸۔ عبدالماجد دریا آبادی، محمد علی ذاتی ڈائری ؛ ص۔ ۱۳۹، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء

۹۔ نورالرحمٰن، دیوانِ جوہر؛ ص۔۹، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۶۲ء

۱۰۔ عشرت رحمانی، حیات جوہر؛ ص۔۵۳، برقی پریس، دہلی، ۱۹۳۱ء

۱۱۔ جعفری؛ سیرت محمد علی، ص۔۲۷۰

۱۲۔ جعفری؛ سیرت محمد علی، ص۔۲۷۳

۱۳۔ عشرت رحمانی؛ حیات جوہر، ص۔ ۳۸

۱۴۔ گل شیر خان، محمد علی کی یار؛ مراری آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۳۱ء

۱۵۔ جعفری؛ سیرت محمد علی، ص۔۲۸۰۔۲۸۱

۱۶۔ Afzal Iqbal, "My Lifeafragment",P.58,AshrafPressLahore,1966,

۱۷۔ نور الرحمان؛ دیوانِ جوہر، ص۔۱۳

۱۸۔ جعفری، ''سیرت محمد علی'' ص۔۲۸۴

۱۹۔ خورشید مہر، ''سیرت محمد علی'' ص۔۶۳۴

۲۰۔ جعفری، ''سیرت محمد علی'' ص۔۲۸۷

۲۱۔ جعفری، ''سیرت محمد علی'' ص۔۲۸۸

۲۲۔ نورالرحمٰن، دیوانِ جوہر؛ ص۱۴

۲۳۔ جعفری، ''سیرت محمد علی''ص۔۳۱۳

۲۴۔ احمد عباس، محمد علی کی سوانح حیات؛ ص۔۲۲

۲۵۔ احمد عباس، محمد علی کی سوانح حیات؛ ص۔۲۳

۲۶۔ خورشید کمال عزیز، مبادیاتِ مذہب، ص۔۳۴، منصور پریس، لاہور، ۱۹۶۱ء

"History of the freedom Movement,P.174, Pakistan Historical Society, Karachi,1961

۲۷۔ گل شیر خان، محمد علی؛ ص۔۴۱۔

۲۸۔ رشید احمد صدیقی، گنج ہائے گراں مایہ، ص: ۷، اشرف پریس، لاہور، ۱۹۶۴ء

۲۹۔ دوست قدوائی، گنجینۂ جوہر؛ ص۔۱۷، محراب ادب، کراچی، ۱۹۵۰ء

۳۰۔ Select Writing & Speeches of Maulana Mohammad Ali, P.xviii, Ashraf Press, Lahore,1969.

۳۱۔ دیوانِ جوہر، ص: ۱۴۱